وہ ایک رات....

نصرت شمسی

شمسی گرلز انٹر کالج، انجمن اسٹریٹ، رامپور (یوپی)، موبائل:9045380276

یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے مجھے کئی سال گزر گئے تھے اور آج تک میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ شام ہوتے ہوتے جب میں گھر جانے کے لیے لفٹ سے نیچے اتری اور قدم آگے بڑھائے تبھی فون بج اٹھا۔ میں نے پرس کھول کر فون ریسیو کیا اور اپنا اے۔ٹی۔ایم کارڈ نکالنے لگی، لیکن فون پر بات کرتے کرتے مجھے احساس ہوا کہ میرا اے۔ٹی۔ایم کارڈ شاید پرس میں ہے ہی نہیں۔ میں دوڑ کر پھر اوپر پہنچی۔ لفٹ سے آنے والی ہر روز میں ہی آخری فرد ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد لفٹ مین مجھ سے پوچھ کر لفٹ میں تالا ڈال کر چلا جاتا۔ میں جلدی سے لفٹ کی طرف دوڑی کہ کہیں لفٹ بند نہ ہو جائے، لفٹ مین وہاں نہیں تھا۔ میں جلدی سے اوپر گئی اور اپنا اے۔ٹی۔ایم کارڈ ڈھونڈنے لگی، لیکن وہ وہاں نہیں ملا۔ میں جلدی جلدی واپس آئی، مگر اس آنے جانے میں مجھے بیس منٹ لگ گئے اور واپس آئی تو لفٹ پر تالا پڑ چکا تھا۔ میری ہوا خراب ہوگئی۔ میں گھبرا کر بلند آواز میں بہادر کو آوازیں لگانے لگی۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے بہادر کو بتا کر جانا چاہیے تھا۔ لفٹ والا یہ حصہ ویسے بھی سنسان رہتا تھا۔ سب کے کیبن الگ جگہ پر بنے ہوئے تھے اور اس وقت تک سب ہی جا چکے ہوتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے کہ اب کیا ہوگا؟ ساری لائٹیں بند ہو چکی تھیں صرف ایک لائٹ تھی جو کوریڈور میں جلتی رہتی تھی۔ وہ بہادر جلا کر جا چکا تھا۔

ایک خوف ناک سناٹا میرے روئیں روئیں میں دوڑنے لگا۔ دل کا گھبراہٹ کے مارے برا حال تھا پھر بہادر کا خیال آیا پرس کھولا اور بہادر کا نمبر ملایا، مگر اس طرف سگنل پہلے ہی بہت کم آتے تھے اور اس وقت تو قسمت کی دیوی ناراض تھی۔ اف! کیا کروں؟ گھبراہٹ اور ہول سے برا حال ہو رہا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس وقت سب سے زیادہ یاد آنے والی ہستی اللہ کی تھی۔ زبان سے وہ سارے شعر جو آج دن بھر گنگنائے تھے رفو چکر ہو چکے تھے۔ آنکھیں برسنے لگی تھیں اور خوف بہت تیزی سے میرے آس پاس جمع ہو رہا تھا۔ ہم ہجرت کر جانے والوں کے تو گھر بھی تنہا ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں ہوتا پیچھے کہ فون کر کے پوچھ ہی لے کہ ستارہ تم ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ فلیٹ کی چابی میرے ہاتھوں میں گھوم رہی تھی اور مجھ پر اچھی طرح یہ آشکار ہو چکا تھا کہ اب مجھے صبح دس بجے تک یہیں پڑے رہنا ہے۔ زبان نے تیزی سے اللہ اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا، ابھی تو صرف چھ بجے ہیں۔ لفٹ کے سامنے والی دیوار پیچھے کے میدان سے لگی ہوئی تھی اور اس میں ایک روشن دان بھی تھا۔ جس کی طرف میں نے التجا بھری نظروں سے دیکھا تو آسمان نظر آیا اور تازہ ہوا آنے کا احساس ہوا۔ کوری ڈور میں پھیلی ملگجی روشنی اور چمک دار نظر آنے لگی۔ ایک گھنٹے میں یوں ہی خوف کے سائے میں جیتی رہی پھر پیاس کے احساس سے پرس میں ہاتھ ڈالا۔ شکر تھا پانی اور کچھ کھانے پینے کا سامان ساتھ میں رکھنے کی عادت نے آج بڑا ساتھ دیا۔ پانی بھی آدھی بوتل ہی تھا جسے پوری رات چلانا تھا اور زیادہ پانی کے استعمال سے پھر دوسری ضروریات بھی زندہ ہونے کا قوی امکان تھا۔ بسکٹ کھول کر ایک بسکٹ منھ میں رکھا اور پھر کوئی تدبیر سوچنے لگی۔ موبائل کی طرف دیکھا تو مزید غصہ آیا کہ اس کی دھڑکنیں بھی شاید چند لمحوں کی مہمان تھیں۔ آج کل نیٹ کے چکر میں موبائل کی بیٹری بچتی ہی کہاں ہے؟ جیسے تیسے اللہ اللہ کرتے وقت گزارنے کے لیے خود کو مضبوط کرتی رہی۔ تنہائی، مجبوری اور پریشانی ہو اور شیطان اپنا کام نہ کرے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وسوسے تھے کہ تو چل میں آیا کی روش پر تھے۔ ایک سے ایک فتور، ایک سے ایک برا خیال دل و دماغ میں چلا آ رہا تھا، اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور باہر سے کیڑے مکوڑوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ روشن دان سے ایک ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا اور میں نے چادر کو مزید لپیٹ لیا۔

نومبر کی ابتدائی تاریخیں تھیں، موسم دن میں بھلے ہی کچھ ہلکا سا گرم ہو، مگر رات میں کافی خنکی ہو جاتی ہے۔ آٹھ بج چکے تھے اور روشن دان سے چاندنی کی ایک کرن میرے پیروں کے پاس آنے لگی تھی۔ میں نے اپنا سوجا ہوا منھ اٹھا کر دیکھا تو چاند مسکرا رہا تھا۔ اس وقت لگا یہ چاند ہی میرا

ہمنوا ہے۔ بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں اس سے باتیں کرتی ہوئی اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد وہ بھی سرکتا ہوا نظر آنے لگا اور میرے اندر کی ہمتیں پھر ٹوٹ گئیں۔ اس وقت اپنی مشفق ماں، پیارے ابو اور ہر وقت لڑتے جھگڑتے بہن بھائی بہت یاد آئے۔ سوچا چلو ان تمام اچھے برے وقتوں کو یاد کرلوں اور اپنا محاسبہ بھی کرلوں، رات تو کسی نہ کسی طرح کاٹنی ہی ہے۔ ایک خوف میرے اندر اور پیر پسارنے لگا تھا جسے میں دبا دبا کر رکھ رہی تھی اور وہ یہ تھا کہ کہیں لائٹ نہ چلی جائے اور یہ اندھے کی لکڑی بنا سفید روشنی بکھیرتا بلب سیاہ نہ ہوجائے۔ میں نے پھر اپنا پرس ٹٹولا اور ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد ننھی سی لائٹ کا چائنیز کی رنگ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ جسے جلا کر میں نے اپنی تسلی کرلی اور سیب نکال کر کھانے لگی۔ ادھر قطرہ قطرہ پانی بھی اپنا رنگ دکھانے لگا تھا۔ ٹھنڈک بھی پورے بدن میں اترتی جارہی تھی۔ میں نے اپنا دوپٹہ اتار کر تہہ کر کے اپنے نیچے رکھ کر زمین کی ٹھنڈک کچھ کم کرنی چاہی۔ اسٹول کو پورا سر پر لپیٹ لیا، چادر کو ایک بار پھر ٹھیک کیا اور بیٹھ گئی۔ دن بھر کی تھکن، تنہائی اور خوف..... میں چاہتی تھی کہ کسی طرح میں گہری نیند سوجاؤں اور بس پھر صبح ہی آنکھ کھلے، جب یہ قیامت کی رات گزر چکے، مگر رات کا بڑھتا ہوا سناٹا، چاروں طرف سے آنے والی کیڑوں کی عجیب عجیب آوازیں اور دل کی دھک دھک نے میری حالت اتنی خراب کردی تھی کہ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ زبان اللہ اللہ کرتے سوکھ جاتی تو ایک قطرہ پانی منھ میں ڈال لیتی۔ پانی پیٹ میں زبردست تناؤ پیدا کرتا جارہا تھا اور اسے روک پانا اب میرے لیے اب مشکل تھا۔ اس گھبراہٹ اور بے چینی نے رات گزارنے کے جو سارے رستے کھوجے تھے وہ رفو چکر ہوگئے، پیشاب کی شدت نے پیٹ میں تکلیف پیدا کرنا شروع کردی۔ میں اٹھی اور اس چھوٹی سی لفٹ میں ٹہلنے لگی کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں؟ جسم کی پوری طاقت پیدا ہونے والی اس پریشانی کو روکنے میں لگی ہوئی تھی۔ وقت دیکھنے کے لیے موبائل اٹھایا تو پتہ چلا کہ وہ بھی ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اف خدایا....! یہ کون سی غلطی کی سزا دے رہا ہے مجھے؟ گناہ معاف فرمادے اور میری مدد کر۔ روتے روتے آنکھیں لال، گال سرخ اور جلد میں جلن ہونے لگی۔ اپنے ذہن کو دوسری طرف موڑنے کا ارادہ کیا اور سوچا چلو کچھ لکھنے کی کوشش کروں۔ افسانہ نگاری میرا شوق تھا اور اکثر کچھ نیا لکھنے کی کوشش کرتی تھی پھر پرس کھنگالا کہ کچھ مل جائے۔ ایک تڑا مڑا سا کاغذ ہاتھ آیا۔ کھول کر دیکھا تو اس پر بہت پرانی تاریخ پڑی ہوئی ملی اور کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ بہت آنکھیں گڑا کر پڑھا تو ساری کہانی یاد آ گئی۔

سوچا چلو اسی پر کچھ لکھ لوں، مگر گھبراہٹ اور تکلیف تھی کہ اف! گھڑی نکالی اور وقت دیکھا۔ ایک بجنے والا تھا۔ جیسے تیسے کچھ سوچا اور لکھنے کا موڈ بنانے لگی، مگر دماغ اس وقت کہاں حاضر تھا۔ آنکھیں بند کر کے دیوار سے سر ٹکا لیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ یکا یک مجھے لگا کہ میرے آس پاس کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ بہت سا خوف میرے اندر اتر آیا اور آنکھیں کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بدن میں اور ٹھنڈک اترنے لگی۔ وحشت اور گھبراہٹ طاری تھی دل کی دھڑکن سن کر یوں لگتا تھا کہ بس اب اگلی سنائی ہی نہ دے گی۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس کیفیت سے دوچار تھی کہ اچانک گھپ اندھیرا ہوگیا، میں نے اپنی گود میں رکھا سامان پکڑ لیا اور لفٹ کے چینل کو دوسرے ہاتھ سے کس کے اس طرح پکڑ لیا گویا اب تا عمر نہیں چھوڑوں گی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا، کیڑوں کی سوسو کرتی آوازیں اور میں... میرا حلق جیسے جکڑ گیا، دل کی دھڑکنیں اتنی تیز سنائی دینے لگیں کہ چاروں طرف جیسے بس انھیں کا شور تھا۔ ٹانگیں بالکل بے جان ہوگئیں اور جسم میں کپکپاہٹ طاری ہونے لگی۔ میری اکلوتی ٹارچ بھی کہاں گر چکی تھی پتہ نہیں۔

ایک خوفناک سناٹا تھا اور سیاہ کالی رات، مجھے بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا اور وہ انجانا سا احساس رگوں میں خون جمائے دے رہا تھا۔ کچھ ہو رہا تھا میرے آس پاس، لیکن کیا یہ میں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ لائٹ گئے ہوئے کوئی پندرہ منٹ گزر چکے ہوں گے۔ مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ یہ قیامت خیز گھڑیاں میری زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں۔ اب بس ستارہ ختم، تبھی اچانک میرے منھ پر تیز روشنی پڑی۔ میں نے خوشی اور گھبراہٹ میں آنکھیں کھول دیں، اب جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا وہ.... وہ اسے میں کیا نام دوں۔ میں نے دیکھا یکا یک پوری یونیورسٹی جگمگا اٹھی اور میرے اردگرد چہل پہل سی ہونے لگی۔ بہت سی آوازیں اچانک میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں پھر اچانک میری مٹھی میں قید لوہے کا جال کسی کے لمس سے آزاد ہوا اور لفٹ کے گرل کا تالا کھولا گیا۔ میں اپنے پیروں پر تو بالکل نہ اٹھی تھی یہ تو مجھے پورا یقین ہے ہاں مگر کسی نے مجھے اٹھا کر لفٹ کے اندر دیوار سے چپکا دیا تھا۔

اچانک یونیورسٹی میں جیسے دن نکل آیا۔ ہر کلاس روم جگمگ جگمگ ہو رہا تھا۔ لوگ ادھر سے ادھر ہاتھوں میں کتابیں لیے آجا رہے تھے۔ کچھ پروفیسرز داڑھی والے تھے اور کچھ کلین شیو تھے۔ لفٹ کا بھی بھرپور استعمال ہو رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کے روز کی طرح ہنسی قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ سارے شعبوں میں تعلیم جاری تھی اور تمام پروفیسرز کے

کیبن بھی کھلے ہوئے تھے۔ مجھے بس فائلیں دبائے لوگ ادھر سے ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ میں بھی کسی چیز کے سہارے ہر کلاس میں آئی، گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے پوری پوری کلاس چل رہی تھی۔ سارے کمپیوٹر آن تھے۔ نہ سمجھ میں آنے والا ایک شور تھا۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آجارہی تھی، مگر کیسے یہ مجھے علم نہ تھا۔ طلبا سے کمرے بھرے پڑے تھے اور ان میں سے کچھ چہروں کو تو میں اچھی طرح پہچانتی بھی تھی۔ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، مگر لگ رہا تھا میں کسی کو نظر ہی نہیں آرہی ہوں۔ ہاں مجھے اتنا یاد ہے کہ میرا جسم گیلے کپڑے کی طرح ہو رہا تھا جس میں سے بالٹیوں پانی نکل سکتا تھا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اوپر نیچے آجارہے تھے۔ کلاسز بدلی جارہی تھی۔ پروفیسرز باتیں کرتے میرے آگے پیچھے دائیں بائیں سے گزر رہے تھے۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزر چکا ہوگا جب میں اسٹاف روم میں لائی گئی۔ لذیذ کھانوں کی جانی پہچانی اشتہا انگیز خوشبو میرے نتھنوں سے گزر کر میرے معدے میں اترنے لگی۔ میں اسے قوت شامہ سے پہچان رہی تھی، لیکن کچھ کھانوں کی مہک میرے لیے اجنبی تھی۔ سب روز کی طرح اپنا اپنا ٹفن کھولے ہنستے مسکراتے لنچ کر رہے تھے۔

میں پوری یونیورسٹی گھوم چکی تھی۔ اتنی تو میں آج تک بھی نہ گھومی تھی جتنی اس رات گھومی، رات سرکتی جارہی تھی اور باہر سے سیاہ نظر آنے والی رات اندر پوری طرح دن بنی ہوئی تھی۔ میرے دانت کٹکٹا رہے تھے اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر گہری غنودگی طاری ہونے لگی۔ لگ رہا تھا آوازیں کبھی قریب اور کبھی دور سے آرہی ہیں۔

چار بجتے بجتے لائٹیں بند ہونے لگیں اور لوگ آپس میں الوداعی الفاظ ادا کرنے لگے۔ لفٹ تو برابر اپنا کام کر رہی تھی۔ آدھے گھنٹے میں پوری یونیورسٹی میں سناٹا سا چھانے لگا پھر کسی نے بہادر کو آوازیں لگائیں، میرے کان کھڑے ہوئے کہ بہادر مجھے دیکھ کر کچھ کہے گا۔ بہادر کی آواز پر ایک لمبا چوڑا الفٹ مین آیا اور اس نے لفٹ کا چینل بند کر دیا اور چلا گیا۔ میرے چاروں طرف جامد سناٹا اور سیاہی چھا گئی۔ اس بار اس اندھیرے نے میرے ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے کر دیے کہ آج میری زندگی میں یہ ہو کیا رہا ہے؟ میرے سر کا ایک اک بال جیسے پانی میں ڈوبا ہوا تھا خوف سے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا ہاں مجھے اب پیٹ میں راحت محسوس ہونے لگی تھی۔ اندھیرا یوں ہی کوئی پندرہ منٹ اور رہا ہوگا یا اس سے کچھ کم، دہشت میں لمحے بھی تو صدیاں لگتے ہیں اس لیے کچھ سہی پتہ نہیں پھر اچانک وہی سفید بلب جل اٹھا جو شام کو بہادر جلا کر گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں میں چیخی تھی اور بہت زور سے چیخی تھی۔ مجھے لگا کہ آسمان کی پو پھٹ چکی تھی اور کچھ وقت بعد مجھے لگا کہ جیسے بہادر آ گیا ہو۔

میں بری طرح چیخ رہی تھی اور ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ ''بچاؤ، کوئی مدد کرو۔'' یہ آوازیں میرے کانوں نے سنیں، میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، مگر یہ کیا؟ میں تو اپنے کمرے میں اپنے بستر پر تھی، تو وہ کیا تھا جو پوری رات میرے ساتھ ہوتا رہا؟ خواب؟ خواب یا میرے ان سوالوں کا جواب جو میں اس دوسری مخلوق کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ ہم انسان اپنی محفلوں میں اس مخلوق کا کتنا ذکر کرتے ہیں کیا وہ بھی اپنی محفلوں مجلسوں میں ہمارا ذکر کرتے ہیں؟ ان کی دنیا کیسی ہے اس میں کب کیا اور کیسے ہوتا ہے؟

کئی منٹ بعد میں خود پہ گزری قیامت سے باہر نکل پائی اور خود کو یقین دلایا کہ جو کچھ ابھی گزرا ہے وہ صرف ایک خواب تھا۔ شکر تھا میں اپنے بیڈ پر تھی، لیکن جو دیکھ اور گزار کر آئی تھی اس کے پورے پورے اثرات بستر پر موجود تھے۔ میرا پورا بدن ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک ننھا سا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ موبائل اٹھایا تو وہ واقعی بند تھا۔ آس پاس اور بھی بہت سی نشانیاں تھیں۔ ٹارچ ڈھونڈی جو بستر پر پڑی تھی۔ وقت دیکھا چار بج چکے تھے تو کیا؟ خوف مجھ پر دوبارہ طاری ہونے لگا۔ تو کیا.... کیا ابھی مجھے اس خوف کے سائے میں اپنی دنیا کی رات کا باقی حصہ کاٹنا ہے اور اپنی دنیا کے سورج اگنے تک خوف کے سائے تلے رہنا ہوگا۔ میں نے ٹارچ کو کس کے ہاتھ میں پکڑ لیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میرے کانوں میں ان عجیب وغریب قسم کی سواریوں کی آوازیں ابھی تک گونج رہی تھیں جن کے آنے کا احساس پہلے آسمان اور پھر زمین پر ہو رہا تھا۔ میرا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں صرف دو ہی آوازیں آرہی تھیں ایک گھڑی کی ٹک ٹک اور دوسری میرے سینے سے دھک دھک..... میں نے خوف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ میرے کمرے کا واحد چراغ گل ہو گیا اور میرا خوف مذید بڑھ گیا۔ جسم سے جان نکل رہی تھی اور ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ میں نے جلدی سے ٹارچ جلا کر اپنے منھ پر روشنی کی اور کمبل کو اپنے ارد گرد آہنی دیوار سمجھ کر اس میں لپیٹ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ جیسے یہ کمبل نہ ہو کوئی محفوظ قلعہ ہو جس کے باہر صرف خوف وحراس ہو اور کچھ نہیں۔

یہ خواب تھا یا حقیقت میں میرے ساتھ کچھ ہوا تھا یہ تو مجھے علم نہیں ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ آج میں یونیورسٹی کی لفٹ میں پھنس گئی تھی۔

◆◆◆